"شامِ شعرِ یاراں ": مغالطے اور وضاحتیں

Misconceptions and Explanations" Shaam-e-Sher-e-Yaraan"

[i] ڈاکٹر محمد شہباز [ii] ڈاکٹر عرفان توحید [iii] شرافت علی

Abstract:

Mushtaq Ahmad Yousufi is not only a milestone in the Urdu satirical and humorous tradition, but all his creations have captivated an era. They offer an unparalleled example, but his latest work, "Shaam-e-Sher-e-Yaraan", has been the subject of debate in some Literary circles in various respects in this regard. There is less emphasis on authorship, which has affected Yousufi's literary reputation. In this article, scribe summarizes this discussion and tries to present a critical and research review of" Shaam-e-Sher-e-Yaraan.".

Keywords: *Mushtaq Ahmad Yousufi, Shaam-e-Sher-e-Yaraan, Perfectionist, Satire and humor, Self-directed humor.*

مشتاق احمد یوسفی اُردو کی طنزیہ و مزاحیہ روایت میں نہ صرف ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، بل کہ اُن کی جملہ تخلیقات نے ایک زمانے کو اپنا گرویدہ بنائے رکھا ہے۔ بالخصوص اُن کی ابتدائی چاروں تصانیف اُردو کی طنزیہ و مزاحیہ نثر کا عدیم المثال نمونہ پیش کرتی ہیں، تاہم اُن کی منظرِ عام پر آنے والی آخری تصنیف "شامِ شعرِ یاراں "اِس ضمن میں مختلف حوالوں سے بعض حلقوں میں موضوعِ بحث رہی کہ یوسفی کی مذکورہ کتاب دیگر چار کتب کے مقابلے میں نسبتاً ایک کم زور تصنیف ہے، جس کی وجہ سے یوسفی کی ادبی ساکھ متاثر ہوئی ہے۔ اِس مضمون میں اِسی بحث کو سمیٹتے ہوئے "شامِ شعرِ یاراں "کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

کلیدی الفاظ: مشتاق احمد یوسفی ، شامِ شعرِ یاراں ، کاملیت پسند ، طنز و مزاح ، طبع زاد مزاح۔

"آبِ گم" (۱۹۹۰ء) کی اشاعت کے تقریباً ربع صدی بعد مشتاق احمد یوسفی (۱۹۲۳ء۔ ۲۰۱۸ء) کی آخری تصنیف "شامِ شعرِ یاراں"، جسے آرٹس کونسل کراچی کے تعاون سے ۲۰۱۴ء میں شائع کیا گیا۔ آرٹس کونسل کراچی کے سیکرٹری سید احمد شاہ اور انجمنِ ترقیِ اُردو کی سیکرٹری فاطمہ حسن (پ۔ ۱۹۵۳ء) نے اِس کتاب کی اشاعت کے تمام اُمور کو اپنی نگرانی میں مکمل کروایا۔ اِس مجموعے کی تقریب رُونمائی ساتویں عالمی اُردو کانفرنس کراچی کے موقع پر انجام پائی۔ اِس تصنیف میں سابقہ روایات کے برعکس دیباچہ یا مقدمہ ایسی کوئی تحریر شاملِ کتاب نہیں، جب کہ مختلف مواقع پر پڑھی گئی اکیس کے قریب تحریریں اِس کتاب کا حصہ

[i] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، گورنمنٹ اسلامیہ گریجوایٹ کالج، سول لائنز، لاہور
[ii] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، لاہورلیڈز یونیورسٹی، لاہور (Corresponding Author)
[iii] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ اسلامیہ گریجوایٹ کالج، قصور

ہیں۔ کتاب کے مندرجات پر نگاہ دوڑائیں تو اِس کی بوقلمونی اور کثیر الجہتی کا احساس شدت سے دامن گیر ہوتا ہے۔ جہاں تک اِس تصنیف کے عنوان کا تعلق ہے تو حسبِ سابق اِس کتاب کا عنوان بھی ایک تلمیح، یعنی فیض احمد فیض (۱۹۱۱ء۔ ۱۹۸۴ء) کے شعری مجموعے "شامِ شہرِ یاراں" سے اخذ کیا گیا ہے۔ اِس مجموعے کی ایک معروف نظم "اے شام مہرباں ہو"، جو شام کے ڈھل جانے کی علامت بن کر گزرے ہوئے وقت کے رتجگوں، شعر وادب اور دوستوں کی محافل کو یاد دلاتی ہے، اِس نظم کے اشعار سے زیرِ مطالعہ تصنیف کے نام کی گہری نسبت ہے۔ گویا یوسفی کی یہ اپنی زندگی کی شام ہے، جو "شامِ شعرِ یاراں" کے نام سے عالمِ ظہور پر آئی ہے۔ (۱) بہ قولِ فیض:

اے مہ شبِ نگاراں
اے رفیقِ دلفگاراں
اس شام ہم زباں ہو
اے شام مہرباں ہو
اے شام مہرباں ہو
اے شام مہرباں ہو
ہم پہ مہرباں ہو(۲)

مذکورہ کتاب کے مشمولات میں قائدِ اعظم فوج داری عدالت میں، کیس ہسٹری، ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے، انڈس ویلی اسکول آف آرٹ اینڈ آرکیٹیکچر، کلاہ مریزی، فرمودات فیضی، لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز، نیرنگ فرہنگ، مہرِ دونیم، چادر، چاندبی بی اور کالم بھر چاندنی، یادگارِ طرحدار، آم، روہو اور بچھو، سد سمندری، ضمیر واحد متبسم، مسند صدارت پر اولتی کی ٹپاٹپ، شاہ جی کی کہانی دوسرے شاہ جی کی زبانی، الطاف گوہر اور گُڑ کی ڈلی، یہاں کچھ پھول رکھے ہیں، میں اختتام ہوں اِک عہد کے افسانے کا، پلکوں سے پینٹ کرنے والا مصوّر اور قصہ خوانی بازار سے کوچۂ ماضی گیراں تک ایسی تحریریں اِس کتاب کا جزو ہیں۔ اِس مجموعے کی اشاعت کے بعد ادبی حلقوں میں آنے والا ردِ عمل کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہ تھا۔ اِس حوالے سے یوسفی کو تعریف سے کہیں زیادہ تنقیص کا سامنا رہا۔ نتیجہ معلوم اِس مجموعے کے بارے میں متضاد اور منفی گویا ہر طرح کے تبصرے ہوئے۔ بہ زبانِ خلق مشہور یہی ہے کہ مذکورہ کتاب بہ ذاتِ

خود یوسفی نے ترتیب نہیں دی، بل کہ اُن کے اعزہ واحباب نے مختلف مضامین کو یک جا کر کے کتابی صورت میں شائع کر دیا، جس میں یوسفی کی رضا شامل نہ تھی۔(۳) دوسرے کہا جاتا ہے کہ یہ تصنیف اُن کی زندگی میں منظرِ عام پر تو ضرور آئی، مگر اِس کتاب کے مندرجات کے انتخاب میں اُن کا کوئی حصہ نہیں تھا۔(۴) سنا گیا ہے کہ یوسفی اِس کتاب کی اشاعت کے حق میں بھی نہیں تھے۔ مزید یہ کہ وہ اِس کتاب کی تقریب رُونمائی میں بھی بادلِ نخواستہ محض اِس شرط پر شریک محفل ہوئے کہ وہ نہ تو کوئی تقریر کریں گے اور نہ ہی کسی شخص کو آٹو گراف دیں گے۔(۵) معروف یہی ہے کہ چوں کہ یہ کتاب یوسفی کی منشا کے خلاف شائع کی گئی تھی، اِس لیے اِس میں یوسفی نے کوئی دیباچہ وغیرہ نہیں لکھا، لیکن بعض قریبی دوستوں کے اصرار کے سامنے اُنھوں نے اپنی ساری زندگی کی ساکھ کو تیاگ دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اِس کتاب کی اشاعت سے اُنھیں توہر اعتبار سے گزند ہی پہنچا، مگر گود بھر بھر کے فائدہ بہت سوں نے سمیٹا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مندرجہ بالا اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے مشتاق احمد یوسفی کے صاحب زادے ارشد یوسفی، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کو بھیجی گئی ایک میل میں لکھتے ہیں:

> "اِن مضامین کو شائع کرنا اُن (یوسفی) کی دیرینہ خواہش تھی، اور کتاب کی اشاعت کو اُن کی مکمل منظوری، تعاون اور اجازت حاصل تھی۔ لہٰذا یہ غلط بیانی ہے کہ اِس کی اشاعت میں اُن کی رنجش اور نیم رضامندی تھی۔"(۶)

مندرجہ بالا ارشد یوسفی کے مقتبس بیان سے یہ بات تو صاف ہو جاتی ہے کہ یوسفی اِن مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، مگر یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یوسفی مذکورہ مضامین کو اِسی حالت میں اپنے قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے کہ جس صورت میں انھیں موجودہ کیفیت میں شائع کیا گیا ہے یا پھر اِن کے لیے بھی یوسفی ایسے کاملیت پسند کی دیگر تصانیف کی طرح "پال" کی تعزیر لازم تھی۔ چوں کہ اِس کتاب کے مندرجات میں شامل ہر مضمون کے ساتھ تقریب رُونمائی، سیمینار سے خطاب، کلچرل سنٹر کی دعوت، پریس کی دعوت، کسی نمائش کا افتتاح اور جلسہ تقسیمِ انعامات ایسے ٹیگ (Tag) پیوست ہیں، جن کی وجہ سے بعض ناقدین نے اِس کتاب میں شامل مضامین کو تعزیتی، تہنیتی، اجرائی اور صدارتی نوعیت کی روایتی تقاریر وخطابات کا نام دیا ہے، جن میں بیان کی یکسانیت اور تکرارِ واقعات

کی بازگشت کسی قدر مطالعے کا مزا کرکرا کر دیتی ہے۔ اِس ضمن میں برطانوی نشریاتی ادارے بی بی سی اُردو سروس کے تبصرہ نگار ظفر سید رقم طراز ہیں:

> "تقریباً سبھی مضامین میں یوسفی جگہ جگہ نہ صرف "اپنا ہی قطعِ کلام" کرتے ہوئے بات کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں، بل کہ کئی دفعہ تو قطعِ کلام کا بھی قطعِ کلام کر دیتے ہیں اور ہانپتا کانپتا قاری ڈور کا سرا ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہار جاتا ہے۔"(۷)

اِس کتاب کے بارے میں بعض محبانِ یوسفی کی عمومی رائے یہی ہے کہ یوسفی کا شان دار اور ناقابلِ شکست ادبی سفر "آبِ گم" پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ "آبِ گم" یوسفی کی تخلیقی اور فطری صلاحیتوں کا بھرپور اظہار ہے، مگر "شامِ شعرِ یاراں" میں یوسفی کا فن کسی قدر مجروح ہوا ہے، وہ اِس لیے کہ اِس کتاب میں چند بہترین مضامین کے جلو میں مختلف النوع تقاریب میں پڑھے گئے بعض فرمائشی اور قلم برداشتہ مزاج کے حامل مضامین گویا "لگے ہاتھوں" شاملِ کتاب کر دیے گئے ہیں، جن میں تکرار کا نقص بہ طورِ خاص ذوقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ اِس حوالے سے ظفر سید کا کہنا ہے کہ:

> "کتاب کیا ہے، طرح طرح کی الم غلم تحریریں جمع کرکے بھان متی کا کنبہ جوڑ رکھا ہے۔ اگر کالموں کے کسی مجموعے کی تقریبِ رُونمائی میں تقریر کی ہے تو اُسے بھی کتاب کی زینت بنا دیا ہے، کسی مرحوم کی یاد میں تاثرات پیش کیے تو کتاب میں درج کر ڈالے، سالانہ مجلسِ ساداتِ امروہہ میں اظہارِ خیال کیا تو لگے ہاتھوں اُسے بھی شامل کر دیا اور پھر تکرار ایسی کہ خدا کی پناہ کئی ایسی باتیں جو نصف صدی سے دوسری کتابوں میں کہتے چلے آئے تھے، انھی الفاظ میں اسی انداز سے یہاں بھی دہرا دیں۔ یہی نہیں بل کہ خود اسی کتاب کے مضامین میں بھی جگہ جگہ کسی ایسے پہاڑ کی سیر کا سماں ملتا ہے، جہاں ایک بار صدا بلند کرنے کے بعد تا دیر اُس کی بازگشت اِدھر اُدھر سے گونج کر سماعت سے ٹکراتی رہتی ہیں۔"(۸)

بلاشبہ یوسفی کا شمار ایسے ادیبوں میں ہوتا ہے، جو کم نویس تھے اور اپنی تحریروں پر آخری سطح تک محنت و ریاضت کرنے کے قائل تھے، ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملے کی چولیں خوب ٹھونک بجا کے چیک

کرتے، لکھنے کے بعد لکھے ہوئے مواد کو "پال" کے حوالے کر دیتے اور اِس جادوئی عمل کے بعد اگر لکھی ہوئی تحریر سے دل مطمئن ہو گیا تو زیرِ تجربہ و مشاہدہ تحریر اشاعت پذیر ہو جاتی، وگرنہ اُس بے چاری کے مقدر میں ہمیشہ کے لیے اندھیرے لکھ دیے جاتے۔ (۹) لکھنے لکھانے اور شائع کرانے کے معاملے میں یوسفی کے اپنے اصول تھے، اِس ضمن میں وہ دوسروں کے اصولوں پر عمل نہیں کرتے تھے۔ (۱۰) اپنی تخلیقات کے بارے میں یوسفی کا ذاتی رجحان تو یہ تھا کہ وہ اپنی تحریروں کو چھپوانے میں عجلت سے کام نہیں لیتے تھے، بل کہ اِس ضمن میں اُن کا اپنا بیان ہے کہ:

> "میرا طریقہ یہ ہے کہ جب کچھ لکھتا ہوں تو اُسے لکھنے کے بعد ایک طرف ڈال دیتا ہوں، جس کو میں پال میں ڈالنا کہتا ہوں۔ جب پک جائے گا تو اسے نکالیں گے۔ لکھنے کے بعد میں کم سے کم چھ مہینے اور اِس سے بھی زیادہ قطعی نہیں دیکھتا۔ اس کی شرط یہی ہوتی ہے۔ میں نے زیادہ سے زیادہ چار سال تک اپنا لکھا ہوا نہیں دیکھا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جب میں سال دو سال بعد اسے اٹھا کر دیکھتا ہوں ایک قسم کا تناظر پیدا ہو جاتا ہے۔ تازہ بہ تازہ تحریر میں تو آدمی کا جذباتی الجھاؤ اتنا ہوتا ہے کہ اسے اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔" (۱۱)

اپنے وضع کیے ہوئے اُصولوں پر اُنھوں نے ساری زندگی سختی سے عمل بھی کیا۔ "آبِ گم" کے پیش لفظ میں یوسفی نے بہ ذات خود یہ مژدہ سنایا تھا کہ "آبِ گم" کی طرز پر پانچ مضامین اور موجود ہیں، مگر طویل ترین انتظار کے بعد وہ آج تک زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکے۔ (۱۲) بتایا جاتا ہے کہ "آبِ گم" کے بعد اُنھوں نے چار سو صفحے کا ایک "ناول" اور سات سو صفحات کو محیط "دو سفر نامے" (۱۳) بھی لکھے، مگر اُن کے اندر کے نقاد نے اُنھیں شائع کرنے کی اجازت نہ دی۔ جب اُن سے ایک انٹرویو کے دوران پوچھا گیا کہ "زرگذشت" کا لکھا گیا دوسرا حصہ اور "آبِ گم" کے مزید پانچ ابواب کیا ہوئے تو اُنھوں نے جواب دیا:

> "وہ میں نہیں چھپواؤں گا، کیوں کہ اُن سے مجھے دل چسپی نہیں رہی۔" (۱۴)

بعینہٖ اشفاق احمد ورک نے ایک مرتبہ اُن سے دریافت کیا کہ بیس برس قبل "آبِ گم" کے ساتھ پیدا ہونے والی نسل، جو اب جوان ہو گئی ہے، اُس کا کہنا ہے کہ "آبِ گم" کے بعد یوسفی صاحب کہاں چلے

گئے؟جس پر یوسفی صاحب یوں گویا ہوئے:

"دھیمی دھیمی ہنسی ہنستے ہوئے بولے: بھئی لگا ہوا ہوں، چار سو صفحے لکھ چکا ہوں، اِس موضوع کو مکمل کرنے کے لیے کم و بیش اتنے ہی صفحات اور لکھنا ہوں گے۔ عرض کیا: چار سو صفحات تو بہت ہوتے ہیں، اُن کو تو چھپوا دیں! کہنے لگے: بھئی ابھی تو اُس کا ہیر و پیدا ہوا ہے!! پوچھا کہ یہ بھی کوئی "آبِ گم" قسم کی چیز ہے؟ فرمانے لگے: نہیں! یہ اس سے بالکل مختلف ہے، اب کے ایک اور ہی طرف نکل گیا ہوں۔ اس کو مکمل کروں گا۔ پھر دیکھوں گا۔ اگر تب اِس کے معیار سے مطمئن ہوا تو یہ چھپ جائے گی، وگرنہ جو کچھ لکھا ہے، بہت ہے!!" (۱۵)

کچھ ایسا ہی جواب ایک اور انٹرویو میں اُنھوں نے یوں دیا:

"جو تحریر مجھے پسند نہیں آتی وہ میں دوسروں کو پڑھوانا کیسے گوارا کر سکتا ہوں۔" (۱۶)

سچ پکے سو میٹھا ہو کے مصداق یوسفی پہلے لکھتے تھے، پھر اپنے ہی لکھے کو کسی ناقد کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ خود اصلاحی کے خیال سے لفظ، جملہ، بندش، بنت، مضمون، خیال سب کو ٹھونک بجا کر دیکھنے کے قائل تھے، یہ نہیں کہ کاتا اور لے دوڑی، بل کہ اپنی ہی تحریر کو ناکوں چنے چبوا دیتے تھے۔ (۱۷) کہا جاتا ہے کہ "تکمیلیت پسند" مشتاق احمد یوسفی اپنی آخری کتاب "شامِ شعرِ یاراں" سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ شاید اِسے مزید "پال" میں رکھ کر نوک پلک سنوارنے کے خواہاں تھے (۱۸)، یہی وجہ ہے کہ "شامِ شعرِ یاراں" میں اصلی والے یوسفی صاحب دکھائی نہیں دیتے۔ وہ اِس لیے کہ "شامِ شعرِ یاراں" کی تحریروں کو اُنھوں نے پال میں نہیں رکھا۔ (۱۹) بعض قارئین کی جانب سے یہ سوال بھی اُٹھایا جاتا ہے کہ "شامِ شعرِ یاراں" جو بعض حوالوں سے بہ ہر حال یوسفی کے کڑے معیارِ اشاعت پر پورا نہیں اُترتی، اِس کے باوجود اِسے شائع کیا گیا، یعنی اگر بھولی بسری اور منتشر تحریروں کو شائع ہی کرنا تھا تو پھر پچیس برس کا طویل انتظار چہ معنی؟ کچھ اِسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے سیّد عارف مصطفیٰ لکھتے ہیں:

"یوسفی تابڑ توڑ مزاح پہ یقین نہیں رکھتے، اِک عجب سی دھیرج اور باوقار دلکی چال

اُن کی تحریروں کا خاصا ہے۔ کسی حد تک ہومیوپیتھکانہ مزاج پایا ہے، لیکن تاثیر کے اعتبار سے وہ ایلوپیتھک، مگر نتائج کے لحاظ سے جراحت کے ہم پلہ ہے۔"(۲۰)

امرِ واقعہ یہ ہے کہ یوسفی جو کچھ لکھتے تھے، وہ سوچ سمجھ کر، بل کہ پھونک پھونک کر لکھتے تھے۔(۲۱) وہ اپنی ہر تحریر پنسل سے لکھتے تھے، بار بار ربڑ سے مٹا کر الفاظ اور فقرے تبدیل کرتے رہتے تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ تحریر کے معاملے میں وہ کاملیت پسند (Perfectionist) تھے۔(۲۲) کچی پنسل سے "لفظوں کی فسوں کاری"(۲۳) سے یوسفی نے ایسی پکی نثر لکھی ہے کہ گویا "پنسل" ہی توڑ دی ہے۔ یوسفی کا اپنا بیان ہے کہ وہ لکھنے کے لیے ہمیشہ پنسل استعمال میں لاتے تھے، جب کہ اُردو میں لکھنے کے لیے پرانے منشیوں کی طرح زمین پر بیٹھ کر کاغذ گھٹنے پر جما کر لکھتے تھے، مگر انگریزی لکھنا ہو تو کرسی اور میز کے علاوہ لکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ کوئی بھی چیز فوری، ہنگامی یا وقتی حالات میں تحریر کرنے کے بجائے کافی عرصہ تک اُس موضوع پر غور و فکر کرنے کے بعد ہی اُس کی تسوید کیا کرتے تھے۔ یوسفی نے اپنی اُردو کی تمام تحریریں اِسی انداز میں لکھی ہیں۔ وہ اُس وقت تک لکھنا شروع نہیں کرتے، جب تک مضمون کا پورا خاکہ ذہن میں تیار نہ ہو جائے۔ اور تو اور لکھنے سے پہلے ہی پیراگرافس کی تھوڑی بہت ترتیب بھی اُن کے ذہن میں اپنا وجود پیدا کر لیتی تھی۔(۲۴) مجتبیٰ حسین کے نزدیک:

"یوسفی پنسل سے لکھتے ہیں۔ حقیقتاً ایسا ہو گا بھی، کیوں کہ یوسفی کی تحریر اتنی عمدہ ہوتی ہے کہ وہ کئی بار کی تصحیح شدہ، بل کہ ترمیم شدہ اور خوب سے خوب تر کی جستجو کا حاصل لگتی ہے۔"(۲۵)

جب کہ ثروت علی کا کہنا ہے:

"It is said that the reason why Yousufi has not written more is because he is very fastidious and spends a lot of time on the manuscript. He goes over his work time and again, revising, rewriting endlessly before the manuscript is considered good enough to send to the publisher."(26)

یوسفی نے کمیتی اور مقداری لحاظ سے قدرے کم لکھا ہے، اِس لیے اُنھیں اِس اعتبار سے کم نویس

وسُست نویس (۲۷) کہا جاتا ہے۔ اُن کی نثر میں بے ساختہ پن اور فطری بہاؤ قدرے کم ہے اور بیشتر مقامات پر Effort کا احساس ہوتا بھی ہے۔ (۲۸) اِس امر میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ یوسفی قلم برداشتہ لکھنے پر قادر تھے، مگر اپنے لکھے ہوئے مواد کو اشاعت کی غرض سے روانہ کرنے سے پہلے اُس کی خوب ٹھونک بجا کر تراش خراش کرتے اور نوک پلک سنوارنے کے بعد اُسے کچھ عرصہ کے لیے "پال" کے حوالے کر دیتے۔ دو چار برس کے بعد اُس "مظلوم" مسودے کو پال کی قید سے نکال کر پھر سے مطالعہ کرتے، اب کے اگر اُن کے داخلی نقاد نے اجازت دے دی تو منتظر مسودے کو اشاعت کا پروانہ مل گیا، ورنہ سارا مسودہ ایسے غائب کرتے کہ جیسے کبھی عالمِ وجود میں تھا ہی نہیں۔ یوسفی کا یہی طریق تھا، جس پر وہ تا عمر کار بند رہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے نزدیک:

> "وہ اپنی نثر، بل کہ ہر جملے پر خاصی محنت کرتے تھے۔ یہی کام مختار مسعود بھی کرتے تھے۔ دونوں کے جملے اچھے شعروں کی طرح یاد رہ جاتے ہیں اور موقع محل کی مناسبت سے مقتبس بھی ہوتے ہیں، مگر اس سے نثر کی روانی پر فرق پڑتا ہے، جو خیال کی وضاحت، کردار کی نقش گری اور صورت حال کے بیان کے لیے درکار ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یوسفی کا قاری ان جملوں کے سحر میں ایسے گم ہو جاتا ہے کہ اسے نثر کی روانی سے متعلق شکایت نہیں ہوتی۔" (۲۹)

زیادہ تر تحریریں عجلت میں لکھی گئی ہیں، جن میں سے بعض کا مقصد و مدعا خانہ پُری، رسم یا روایت کی تکمیل معلوم ہوتا ہے، جب کہ بعض مضامین کو پولیس کی اصطلاح میں "کارروائی ڈالنا" کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے۔ جن تقریبات میں اُنھیں بہ طورِ مہمانِ خصوصی مدعو کیا گیا، اُن میں اُنھوں نے سامعین و منتظمین کی خواہشات کے احترام میں کچھ نہ کچھ کہنا مناسب سمجھا، جس کے لیے اُنھوں نے زبانی یا فی البدیع طرزِ کلام کے بجائے تحریری انداز اپناتے ہوئے اپنے مخاطبین کے لیے خوش طبعی و خوش دلی کا سامان فراہم کیا، مگر جب یہی ہنگامی نوعیت کی چیزیں جمع کر کے شائع کر دی گئیں تو یوسفی کی نصف صدی کو محیط ادبی شخصیت کو اِس کا شدید نقصان پہنچا اور یوسفی کا نام آب و تاب اور رخشندگی دکھانے کے بجائے اِس کتاب کی اشاعت کے بعد کسی قدر گہنا گیا۔ حمیرا اشتیاق کے نزدیک:

"Every time Mushtaq Ahmad Yousufi, the wordsmith par excellence, penned a book, he came, he saw and he conquered. This time round, for Sham-e-Sher-e-Yaara'n the last segment of the time-honored cliché needs adjustment, he came and he saw all right, but conquered? No. He has failed. Had it been a case with some lesser mortal, one would have thought of adding the qualifier 'miserably' as well, but in Yousufi's case it would be literary blasphemy to use such phrases...especially by someone who happen to be a die-hard out-and-out Yousufi fan."([30])

کتاب کا اوّلین مضمون قائدِ اعظم محمد علی جناح(۱۸۷۶ء۔ ۱۹۴۸ء) کی قانونی بصیرت پر ایک زبردست خراجِ عقیدت کی حیثیت رکھتا ہے، گو کہ بتیس صفحات کو محیط اِس شان دار مضمون میں بابائے قوم کی وکالت اور سیاسی بصیرت کا تذکرہ محض آخری چار پانچ صفحات میں ملتا ہے، مگر اِس امر سے اِس مضمون کی افادیت کسی طور بھی کم نہیں ہوتی۔ آغاز کے صفحات میں یوسفی نے اپنے زمانۂ طالب علمی اور اپنے ہم جلیسوں کا تذکرہ کمال محبت کے ساتھ کیا ہے۔ اِس مضمون کو اگر "حاصلِ کتاب" مضمون قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یوسفی کا یہ مضمون، جسے اُنھوں نے بہ ذاتِ خود "پسِ زرگذشت کا ایک بابِ خواب تمثال" قرار دیا ہے، مگر قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ یوسفی نے یہ مضمون "زرگذشت" کی تخلیق کے زمانے میں ہی لکھا ہوگا، مگر کسی وجہ سے "زرگذشت" کا حصہ نہ بن سکا، جس میں یوسفی نے آگرہ میں اپنے زمانۂ طالب علمی کا تفصیلی نقشہ پیش کیا ہے۔ خاص طور پر اُنھیں ایک مقدمے کے دوران عدالت میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کو بہت قریب سے فعال حالت (In Action) میں دیکھنے کا موقع ملا۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ قائدِ اعظم ایک فوج داری مقدمہ کی پیروی کے سلسلہ میں آگرہ پیشی پر آتے تھے۔ یوسفی بھی اپنے دوست مسرور حسن خان کے ساتھ اِس مقدمے کی کارروائی خاص طور پر قائدِ اعظم کی شخصیت کے پہلوؤں کا نظارہ کرنے کے لیے عدالت میں حاضر ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں یوسفی نے سیسل (Cecil) ہوٹل کا مہنگا ترین وہ کمرا بھی ملاحظہ کیا، جس میں قائدِ اعظم مقدمے کے دوران آگرہ میں قیام پذیر ہوتے تھے۔ یوسفی کو اپنے دوست مسرور حسن خان کے ماموں خان بہادر اختر عادل کے توسط سے جو اِس

مقدمے میں قائد اعظم کے مخالف وکیل تھے، عدالت میں داخل ہونے کا موقع مل گیا، جو گورنمنٹ، یعنی پراسیکیوشن (Prosicution) کی نمائندگی کر رہے تھے، جن کی مدد کے لیے گورنمنٹ نے لکھنؤ سے ایک انتہائی قابل وکیل جے کرم ناتھ مسرا کی خدمات بھی حاصل کی تھیں۔ اِس مہم میں یوسفی کے ساتھ اُن کے ایک اور دوست مظفر برنی (۳۱) بھی اُن کے ہم رکاب تھے۔ اِس مقدمے میں قائد اعظم سیٹھ کے سری چند کی طرف سے وکیلِ صفائی تھے، جنھیں ایک انتہائی ایمان دار مجسٹریٹ رضی الحسن چشتی نے رشوت دینے کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔ اُن کا مقدمہ احمد حسین مجسٹریٹ کی عدالت میں لگا ہوا تھا۔ احمد حسین بھی ایک ایمان دار، نڈر اور دبنگ پراونشل سول سروس (PCS) افسر تھے۔ سیٹھ کے سری چند کے والد، جو اسمبلی کے ممبر ہونے کے ساتھ ساتھ خان لیاقت علی خان سے بھی رسم وراہ رکھتے تھے، اُن کی خواہش تھی کہ اُن کے صاحب زادے کا مقدمہ سر تیج بہادر سپرو لڑیں، مگر اُن کی فیس اُن کی بساط سے باہر تھی، اِس لیے اُنھوں نے لیاقت علی خان سے درخواست کی کہ وہ قائد اعظم کو اِس مقدمہ میں بہ طور وکیلِ صفائی لڑنے کے لیے راضی کریں۔ قائد اعظم نے انکار کر دیا، مگر خان لیاقت علی خان نے ذاتی دل چسپی لیتے ہوئے منت سماجت کر کے قائد اعظم کو راضی کر لیا، مگر اِس شرط پر کہ پانچ ہزار روپے یومیہ فیس ہو گی، جو براہِ راست مسلم لیگ کے اکاؤنٹ میں جمع کر دی جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔ مجموعی طور پر قائد اعظم نے اِس مقدمے کی اکتیس دنوں تک پیروی کی، گو کہ اِس قدر مصروفیت میں اُن کے لیے بمبئی سے بذریعہ ٹرین آگرہ آنا اور اِس مقدمے کو لڑنا انتہائی مشکل امر تھا، مگر قائد اعظم نے بغیر کسی عذر اور تاخیری حربے کے اِس کیس کی پیروی کی۔

یوسفی نے اِس تحریر میں قائد اعظم کے متعلق اپنے مشاہدات کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قائد اعظم اوّل تو وقت کے انتہائی پابند تھے، دوسرے مقدمے میں وہ بھرپور تیاری کے ساتھ حاضر ہوتے تھے، تیسرے اُن کی خود اعتمادی کا عالم بیان کی حد سے باہر ہے۔ مقدمے کی پیروی کے دوران حسبِ روایت اِس قسم کی چہ میگوئیاں بھی ہوتی رہیں کہ سیٹھ کیسری چند نے قائد اعظم کو محض اِس غرض سے اپنا وکیل مقرر کیا تھا، کیوں کہ اِس مقدمے کا مجسٹریٹ بھی مسلمان تھا، جس کی وجہ سے کیسری چند بہ آسانی کیس جیت جائیں گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قائد اعظم نے یہ کیس کسی قدر تامل کے بعد لیاقت علی خان کی درخواست پر محض تالیف قلب کے لیے لیا تھا۔ حال آں کہ قائد اعظم کے لیے یہ کیس ایک زحمت اور کسی

قدر مالی نقصان کا بھی سبب بنا، تاہم یہ تمام بد گمانیاں اُس وقت دم توڑ گئیں، جب قائد اعظم کے مضبوط دلائل کے باوجود مسلمان مجسٹریٹ احمد حسین نے سیٹھ کیسری چند کو سزائے با مشقت کا مرتکب قرار دیا۔ اِس پر ایک نئی بحث (Consipiracy) کا آغاز ہو گیا کہ مجسٹریٹ صاحب نے جان بوجھ کر کیسری چند کے خلاف فیصلہ دیا ہے، تاکہ وہ خود کو غیر جانب دار پیش کر کے اپنی ملازمت کو طول دے سکے۔ مختصر یہ کہ آگرے سے رُخصت ہونے سے قبل قائد اعظم نے کیسری چند کے وکیلوں کو Ground Of Apeal نوٹ کروائے اور اُنھی ڈکٹیٹ (Dictate) شدہ نکات کے مطابق اپیل داخل کی گئی، جس کی بنا پر آخر کار فیصلہ کیسری چند کے حق میں ہو گیا اور وہ رہا کر دیے گئے۔ اِس مضمون میں یوسفی قائد اعظم کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کسی قدر محویت کے عالم میں لکھتے ہیں:

> "میں چہرہ دیکھنے میں اِتنا محو تھا کہ کسی اور طرف نظر نہیں گئی تھی۔ بعد میں ان کی تقریر علی گڑھ یونیورسٹی میں بھی سننے کی سعادت نصیب ہوئی۔ مجھے تو یوں لگا جیسے "چہرہ ہی چہرہ پاؤں سے سر تک" اور چہرہ بھی وہ جو غیر متزلزل عزم واستقامت کی تصویر ہو۔" (۳۲)

یوسفی نے "کیس ہسٹری" نامی مضمون نما تقریر ۳ مارچ ۱۹۸۸ء کو پاکستان سوسائٹی آف فزیشنز کے سالانہ ڈنر میں بہ طورِ مہمانِ خصوصی کی تھی۔ حال آں کہ یوسفی کے نزدیک:

> "اِن حالات میں ڈاکٹروں کے اس صحت بخش اجتماع میں اس اکلوتے مریض کو مہمان خصوصی کے بجائے بیمارِ خصوصی کہا جائے تو عزت افزائی کے علاوہ قرین حقیقت بھی ہو گا۔" (۳۳)

یہ دراصل یوسفی کا اِس تقریب کے لیے دیا گیا کلیدی خطبہ تھا، جس کے لیے یوسفی خاص طور پر لندن سے پاکستان تشریف لائے تھے۔ آغازِ کار میں یوسفی کراچی اور لندن کے موسم کے بارے میں خوب صورت تاویلات پیش کرتے ہوئے لندن کی رہائش گاہوں کا اُن کی تنگ دامانی کی وجہ سے تمسخر اُڑاتے ہیں۔ ازاں بعد یوسفی نے کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے اپنی ذات پر بڑھ چڑھ کر وار کیے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ لمبی لمبی تقریریں کرنے والوں کے بھی خوب لتے لیے ہیں۔ اِسی طرح دعوتی کھانوں کے متعلق بھی یوسفی نے

بہترین مزاحیہ تاویلیں پیش کی ہیں، جو قاری کے تفننِ طبع کا وافر سامان فراہم کرتی ہیں، لیکن ڈاکٹروں، نرسوں اور شعبۂ طب کے دیگر متعلقات و مسائل پر یوسفی نے جو پُر تفنن گرفت کی ہے، اُردو طنز و مزاح کی روایت میں اِس کی مثال شاذ ہی ملتی ہو۔ ذرا دیکھیے:

> "دُنیا میں جتنی بھی لذیذ چیزیں ہیں، اُن میں سے آدھی تو مولوی صاحبان نے حرام کر دی ہیں اور بقیہ آدھی ڈاکٹر صاحبان نے!" (۳۴)

"ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے" فیض احمد فیض کے حوالے سے ۲۵ مارچ ۲۰۰۱ء کو آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی میں پڑھا گیا یہ مضمون ۱۲ فروری ۱۹۹۲ء میں "فیض امن میلہ: نذر کمال" میں پڑھے گئے مضمون اور ۲۳ نومبر ۱۹۸۴ء فیض احمد فیض کے انتقال پر اُردو مرکز لندن میں پڑھے گئے تعزیتی مضمون کا بوجھ بھی اُٹھائے ہوئے ہے۔ گویا یوسفی نے مختلف مواقع پر فیض کے بارے میں پیش کیے گئے مضامین کا مواد (Material) استعمال کر کے فیض کی ۹۰ ویں سالگرہ پر اُنھیں نہ صرف خراج تحسین پیش کیا ہے، بل کہ اِس مضمون کے ایک ایک لفظ سے یوسفی کی فیض سے والہانہ محبت کا رس ٹپکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یوسفی نے مضمون کے آغاز میں رقص کے حوالے سے ناہید صدیقی اور شیما کرمانی کا ذکر کرتے ہوئے رقص کے متعلقات کے بارے میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اُنھوں نے انڈین چینلز، بالخصوص زی ٹی وی کو فحاشی اور بے ہنگم رقص و سرود کے ضمن میں آڑھے ہاتھوں لیا ہے۔ فیض کے بارے میں یوسفی اپنی پہلی ملاقات اور پھر آئندہ ہونے والی ملاقاتوں اور فیض کی شخصیت اور شاعری کی متنوع جہات کو بڑے خلوص اور احترام کے صیغے میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ایک دفعہ مجھ سے پوچھا، آج کل کچھ لکھ رہے ہیں یا بینک کے کام سے فرصت نہیں ملتی؟ میں نے کہا "فرصت اور فراغت تو بہت ہے۔ مگر کاہل ہو گیا ہوں۔ پتا نہیں مارا جاتا۔ مطالعہ کی عیاشی میں پڑ گیا ہوں۔ اور جب کسی لکھنے والے کو پڑھنے میں زیادہ مزا آنے لگے تو جانیے نِری حرام خوری پر اُتر آیا ہے۔" میں بہت دیر تک خود کو اسی طرح بُرا بھلا کہتا رہا۔ فیض صاحب خاموش سنتے رہے۔ پھر شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اتنے قریب آ گئے کہ اُن کی سگریٹ کی راکھ میری ٹائی

پر گرنے لگی۔ کہنے لگے "بھئی! ہم کسی کی غیبت نہیں سُن سکتے۔ کسی سے کینہ رکھنا اچھا نہیں ہے۔ اپنے آپ کو معاف کر دیا کیجئے۔ عفو و درگزر ثواب کا کام ہے۔"(۳۵)

"انڈس ویلی اسکول آف آرٹ اینڈ آرکیٹیکچر" کے زیرِ عنوان مشتاق احمد یوسفی نے یہ خطبہ ۱۴ دسمبر ۲۰۰۱ء میں انڈس ویلی اسکول آف آرٹ اینڈ آرکیٹیکچر کی جانب سے جلسہ عطاے اسناد کی تقریب میں پڑھا تھا، جس کے لیے اُنھیں ایگزیکٹو ڈائریکٹر شاہد صدیقی نے خصوصی طور پر مدعو کیا تھا۔ اِس مضمون میں یوسفی نے اپنے بچپن کے حوالے سے اپنی تصویر کشی (Drawing) کے معیار کا خوب مذاق اُڑایا ہے۔ اِس ضمن میں یوسفی نے اپنے ایک ہندو برہمن اُستاد کا تذکرہ بھی بڑی محبت کے ساتھ کیا ہے۔ اِس میں یوسفی نے مذکورہ اسکول میں طلبہ کی جانب سے بنائی گئی تصاویر اور مجسموں کی بھی حد سے سوا تعریف کی ہے۔ علاوہ ازیں مصوّری کے بارے میں بڑی سنجیدگی اور باریک بینی کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ مذکورہ اسکول میں جلسہ عطاے اسناد کا خطبہ ہمیشہ انگریزی زبان میں دیا جاتا تھا، مگر یوسفی نے اُردو میں خطبہ دے کر اِس رسمِ دیرینہ کا بھی خاتمہ کر دیا۔ یوسفی نے آخر میں ایسے سیاست کاروں کی بھی خوب خبر لی ہے، جو ہر دوسرے دن یہ اعلان فرما دیتے ہیں کہ پاکستان بڑے نازک دور سے گزر رہا ہے:

> "میں یہ کڑوی سی بات خدا اور سیاست دانوں کو حاضر و ناظر جان کر کہنا چاہوں گا کہ گزشتہ پچپن برسوں میں کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرا جب کسی نہ کسی نامور لیڈر یا غوغائی سیاست دان نے بڑے وثوق اور ناقابلِ فہم شماتت کے ساتھ یہ اعلان نہ کیا ہو کہ پاکستان اس وقت بہت ہی نازک دور سے گزر رہا ہے! اس پر سقوطِ ڈھاکہ کے بعد سے یہ اضافہ کیا گیا کہ صورتِ حال بالکل ۱۹۷۱ء جیسی ہے! مطلب یہ کہ پاکستان، خاکم بدہن، دو لخت بلکہ چار لخت ہوا چاہتا ہے! وہ وقفے وقفے سے یہ دھمکی دے کر خوف و ہراس اور افتراق پیدا کرنے کے درپے ہیں۔ وہ ایسے نجومی ہیں، جن کو خود ساختہ Crystal Ball میں جو دھواں، دُھند اور اندھ کار ہمہ وقت نظر آتا ہے وہ دراصل ان کے اپنے دل کا غُبار ہے، جو ووٹ، نوٹ اور لوٹ کھسوٹ کے مزید مواقع حسبِ منشا، یعنی اندھا دھند نہ ملنے کے باعث جمع ہوتا رہا ہے اور

سیاسی پلیٹ فارموں اور بعض کالموں کی کاغذی چمنیوں سے صبح و شام پیچ و تاب
کھاتا، اُٹھتا رہتا ہے۔"(۳۶)

"کلاہِ ممریزی" نامی یہ مضمون یوسفی نے محکمہ ثقافت حکومت خیبر پختون خواہ کی دعوت پر ۱۶ دسمبر ۲۰۰۳ء کو پریس کلب پشاور میں پیش کیا۔ چوں کہ حکومت خیبر پختون خواہ کی وزارتِ ثقافت اُس زمانے میں چھے مختلف شعبوں، یعنی وزارتِ کھیل، ثقافت، سیاحت، امورِ نوجواناں اور آثارِ قدیمہ و عجائب گھر ایسے محکموں پر مشتمل تھی، اِس لیے یوسفی نے آغازِ کار میں مختلف کھیلوں، یعنی کیرم، تاش، لوڈو، فٹ بال اور کرکٹ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اپنی ذات کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ ازاں بعد اُنھوں نے تہذیب کے نام پر فحاشی و بد تہذیبی کی خوب خبر لی ہے۔ پھر اپنے من پسند شعبہ، یعنی سیر و سیاحت کا ذکر کرتے ہوئے اُردو کے روایتی سفر نامہ نگاروں کی خبر لیتے ہوئے بتایا ہے کہ اُنھیں بھی سفر نامہ لکھنے کا بہت شوق تھا، مگر بوجوہ اُن کا شوق پورا نہ ہو سکا۔ شعبہ اُمورِ نوجواناں پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد پھر اِس محکمے کے پانچویں شعبہ عجائب گھر کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فی زمانہ عجائب گھروں کے اندر اشیائے نمائش کے مقابلے میں عجائب گھروں کے باہر زیادہ مقدار میں عجائبات دکھائی دیتے ہیں۔ اِس مضمون میں یوسفی نے اپنے دوست ممریز خان کا خاکہ کمال چابک دستی سے تراشا ہے۔ ممریز خان، جو ایک پابند شرح مسلمان تھا، اُس کی بعض حماقتوں کو یوسفی نے مزاحیہ انداز میں سپردِ قلم کیا ہے:

"دین دار اور پرہیز گار مسلمان ہیں۔ شدید زکام میں بھی ہر چھینک کے بعد الحمد للہ
ضرور کہتے ہیں۔ اگر تابڑ توڑ چھینکیں دم نہ لینے دیں تو قضا پڑھ لیتے ہیں!"(۳۷)

"فرمودات فیضی" کے زیرِ عنواں یوسفی نے یہ مضمون ۷ اپریل ۲۰۰۲ء کو دوست محمد فیضی کی کالموں کی کتاب "اظہارِ خیال" کی تقریب رُونمائی کے موقع پر بہ طور کلیدی خطبہ کے پڑھا تھا۔ دوست محمد فیضی کاروبارِ سیاست سے منسلک ہونے کی وجہ سے چار بار وزیر بھی رہ چکے ہیں۔ اُنھوں نے یوسفی کو صدارتی خطبہ پیش کرنے کے لیے مدعو کیا تھا۔ اِس تقریب میں ادبی شخصیات کے بجائے اہلِ سیاست خاص طور پر جنرل معین الدین حیدر، نثار احمد میمن، راجہ ظفر الحق، الٰہی بخش سومرو اور اعجاز الحق نے بھی خطاب کیا۔ یوسفی نے صاحبِ کتاب اور مندرجاتِ کتاب پر بھی سرسری، مگر پُر مغز بحث کی ہے:

"فیضی اپنی بیگم کے لیے بھی کار کا دروازہ اتنی ہی مستعدی، لپک جھپک اور فدویانہ فروتنی سے کھولتے ہیں جتنی کہ جنرل ضیاء الحق اپنے سے بدرجہا کم مرتبہ و منصب لوگوں کی کار کا دروازہ کھولنے اور ساتھ ساتھ روزی روزگار کا دروازہ بند کرنے میں دکھاتے تھے۔" (۳۸)

"لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز" کے نام سے یوسفی نے یہ خطبہ ۱۶ دسمبر ۲۰۰۴ء کو لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (LUMS) میں جلسہ عطائے اسناد کے موقع پر دیا تھا، برخلافِ روایت یوسفی نے انگریزی کے بجائے اُردو میں خطبہ پیش کیا۔ یوسفی اپنی زبان کی اہمیت وافادیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ گانا، گنتی، گلہ گزاری اور گالی اپنی ہی زبان میں مزہ دیتی ہے!" (۳۹)

علاوہ ازیں اُنھوں نے متعلقاتِ درس وتدریس کے حوالے سے بڑی پُرفکر گفتگو کی ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ اپنی پیشہ ورانہ بینک کی زندگی کے بعض واقعات و مسائل کو بھی مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ خاص طور پر آج کے دور میں نام نہاد تعلیمی اداروں میں دی جانے والی تعلیم اور ڈگریوں کی اوقات و حیثیت کی وہ دُرگت بنائی ہے کہ قاری انگشت بدنداں رہ جاتا ہے:

"آج کل جس تیزی سے بعض مینجمنٹ انسٹی ٹیوٹز اپنی Conveyor سے نیم پختہ اور ان گھڑ MBAs نکال رہے ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مقصد جلب منفعت کے علاوہ تعداد بڑھانا بھی ہے۔ نہ صرف یہ کہ کوالٹی اور ریسرچ ان کے نصاب میں شامل نہیں بل کہ نیت اور نظریۂ تعلیم میں بھی فتور نظر آتا ہے۔" (۴۰)

بہ عنوان "نیرنگ فرہنگ" یوسفی نے یہ مضمون ۲۹ مارچ ۲۰۰۸ء کو اکادمی ادبیات اسلام آباد میں "شان الحق حقی قومی ادبی سے سمینار" میں پیش کیا، جس میں اُنھوں نے اپنے دوست اور معروف محقق شان الحق حقی (۱۹۱۷ء۔ ۲۰۰۵ء) کا خاکہ اڑایا ہے۔ درحقیقت ۱۷ جون ۲۰۰۳ء کو اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری مرتبہ شان الحق حقی کی تقریب تعارف و تبریک میں ایک مضمون یوسفی نے پڑھا تھا۔ مذکورہ مضمون کو یوسفی نے ترمیم واضافہ کے بعد اکادمی ادبیات کی تقریب میں پیش کیا۔ زیرِ بحث مضمون میں یوسفی نے شان الحق حقی کی علمیت کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یوسفی نے شان الحق حقی کو اکملیت پسند (Perfectionist)،

من لگن، جتن اور انہماک سے کام کرنے والا فرد قرار دیا ہے۔ مزید یہ کہ فن سے دل بستگی اُن کے ہاں زہد و ریاضت کا درجہ رکھتی ہے۔ (۴۱) یوسفی نے ساتھ ہی ساتھ یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ شان الحق حقی دراصل لفظوں کے رسیا ہیں۔ لغت نویسی سے اُنھیں فطری و موروثی لگاؤ ہے۔ ترقی اُردو بورڈ کی ضخیم و جامع لغت کی کلیدی تحقیق و تدوین اور ترتیب میں بنیادی نوعیت کا سارا کام اُنھوں نے ہی انجام دیا۔ اِس کام کی تکمیل میں اُنھوں نے اپنی زندگی کے اٹھارہ برس صرف کر دیے اور اب اوکسفرڈ اُردو ڈکشنری تو گویا جدید ترین اور مستند ترین لغات میں نمایاں مقام حاصل کر چکی ہے، کیوں کہ شان الحق حقی معانی و مفہوم کی وضاحت میں سادگی و سلاست کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ مختصر یہ کہ یوسفی نے "فرہنگ تلفظ" کو بھی شان الحق حقی کا ایک اہم کارنامہ قرار دیا ہے۔ خاص طور پر الفاظ کی بندش، غلط روزمرہ و محاورہ، تذکیر و تانیث، تلفظ اور املا کے ضمن میں پُر مغز گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "وہ ہر گناہ، ہر لغزش معاف کر سکتے ہیں، سوائے غلط تلفظ، غلط املا اور غلط روزمرہ کے۔ جب سے ڈکشنری پر کام شروع کیا ہے اضافت اور Punctuation یعنی اوقاف میں Comma کی غلطی پر بھی سختی سے گرفت کرنے لگے ہیں۔ جہاں تک دیگر اقسام کی غلطیوں کا تعلق ہے وہ بزرگانہ چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔ غلط آدمی اور برخود غلط خاتون کو کچھ نہیں کہتے، لیکن تذکیر و تانیث پر اچھے اچھوں کو ڈانٹ دیتے ہیں۔" (۴۲)

"مہرِ دو نیم" میں یوسفی نے افتخار عارف (پ۔ ۱۹۴۰ء) کی شاعری پر کسی مشاق نقاد کی طرح اپنی تنقیدی بصیرت کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ اُنھوں نے افتخار عارف کو ایک نہایت "وضع دار" شاعر قرار دیتے ہوئے اُن کی شاعری کو تین ادوار میں منقسم کیا ہے۔ اُن کے نزدیک افتخار عارف کی شاعری کا پہلا دور اُن کے لندن آنے سے پہلے کی شاعری پر مشتمل ہے، جس میں اُن کے ہاں تنہائی اور بے زمینی کا احساس بڑا شدید ہے، جب کہ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۱ء تک کا زمانہ اُن کی شاعری کا دوسرا دور ہے، جس میں وہ ایک حساس اور خود دار انسان کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یعنی تیسرے دور میں افتخار عارف کے ہاں غور و فکر میں غلطاں اور خود سے ہم کلام اور سوال و جواب کرنے والا شاعر ہمیں دکھائی دیتا ہے، جس کا مزاج یگانہ (۱۸۸۴ء۔ ۱۹۵۶ء) سے ملتا ہے۔ یوسفی کے نزدیک افتخار عارف نے غزل اور نظم دونوں میں اپنی صلاحیتوں

کالو ہامنوایا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی نے "چادر، چاندبی بی اور کالم بھر چاندنی" نامی مضمون معروف افسانہ نگار، ناول نگار، کالم نگار، شاعرہ، فیمی نسٹ، سماجی کارکن، سیاست کار، ایڈیٹر و پبلشر اور "بلبلِ پاکستان" (۴۳) بشریٰ رحمٰن (۱۹۴۴ء۔۲۰۲۲ء) کے کالموں کی کتاب کی کراچی میں منعقدہ تقریبِ رُونمائی کے موقع پر پیش کیا، جس میں اُنھوں نے لگے ہاتھوں ممتاز مفتی (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۹۵ء)، اشفاق احمد (۱۹۲۵ء۔ ۲۰۰۴ء)، انتظار حسین (۱۹۲۳ء۔ ۲۰۱۶ء)، حفیظ جالندھری (۱۹۱۲ء۔ ۱۹۷۳ء) اور محمد طفیل (۱۹۲۳ء۔ ۱۹۸۶ء) کو بھی یاد کیا ہے، لیکن بشریٰ رحمٰن کے شوہر کے بارے میں یوسفی نے بڑے اچھے الفاظ میں اُن کی توصیف کی ہے۔ یوسفی نے اُن کی افسانہ نگاری، سیاست کاری، پنجاب اسمبلی میں اُن کی دبنگ قسم کی تقاریر اور اُن کی شجاعت اور بے باکی کو بہ طورِ خاص موضوعِ بحث بنایا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اُنھوں نے اُن کی سفر نامہ نگاری کے اوصاف کو بھی دل کھول کر بیان کیا ہے:

> "میں نے بشریٰ رحمٰن کے سفر نامے "ٹک ٹک دیدم ٹوکیو" اور "براہِ راست" بڑے شوق سے پڑھے۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں شائع ہونے والے سفر ناموں میں یہ تنہا سفر نامے ہیں، جن میں سڑک پر چلتی خوش شکل خواتین کا ذکر انھیں فی الفور اپنے عقد نکاح یا غرۂ عشرت میں لانے کی نہفتہ خواہش کے بغیر کیا گیا ہے!۔۔۔ سفر ناموں کا ذکر کرنل محمد خاں کے سفر نامے "بسلامت روی" کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔۔۔ کرنل صاحب نے اِتنی ساری میمیں قاری پر بیک وقت چھوڑ دی ہیں کہ ہم جیسے آدمی کا کم زور دل پیہم نسوانی تجلیات کی تاب نہیں لا سکتا۔" (۴۴)

"یادِ یارِ طرحدار" کے عنوان سے یہ خطبہ صدارت اُردو مرکز اسکول آف اورینٹل افریکن اسٹڈیز، لندن کے آڈیٹوریم میں ادب دوست اور ادب نواز سینئر بینکر ابنِ حسن برنی مرحوم کی یاد میں منعقد ہونے والی تقریب میں پڑھا گیا۔ اِس مضمون میں یوسفی اپنے ہم دم دوست ابنِ حسن برنی کو باغ و بہار شخصیت قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ مرحوم بڑے زندہ دل، خوش پوش، خوش باش، خوش گفتار، دوست نواز اور

باہمت انسان تھے۔ مذہبی نوعیت کی گفتگو میں موصوف بند نہیں تھے۔ وہ نہایت شائستہ اور نفاست پسند انسان تھے۔ مرحوم کو عزیزوں کی غیبت سے سخت نفرت تھی۔ اُن کی ادیبوں اور شاعروں سے یاد اللہ تھی۔ برنی مرحوم علی گڑھ سے فارغ التحصیل تھے اور ۱۹۴۳ء میں یوسفی سے اُن کی دوستی کا آغاز علی گڑھ سے ہی ہوا تھا۔ اِس مضمون میں یوسفی نے علی گڑھ یونیورسٹی میں گزارے ہوئے لمحات اور کھانوں کا احوال بیان کیا ہے، جو سراسر لطف سے بھرپور ہے۔ اِسی طرح یوسفی کو لندن میں بھی برنی مرحوم سے دن رات ملاقات کا موقع ملا۔ وہ یوسفی کو لندن کے بازاروں میں اپنے ساتھ لے جاتے اور سستی چیزوں، یعنی سوٹ، ٹائی، جوتے، برتن اور دُخانی استری وغیرہ کی خریداری میں مدد بھی کیا کرتے تھے۔ چوالیس برس تک یوسفی اور برنی مرحوم کی رفاقت قائم رہی۔ یوسفی نے اِس مضمون میں علی گڑھ اور لندن میں بینک کی زندگی کی جھلکیاں جزئیات کے ساتھ پیش کی ہیں۔

"آم، روہو اور بچھو" نامی یہ مضمون ندیم حیدر کی دعوت پر مشتاق احمد یوسفی نے اراکینِ انجمنِ ساداتِ امروہہ کی دعوت میں پڑھا تھا، جس میں یوسفی شہرِ امروہہ کے نام کی مختلف توجیحات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اِس شہر نے بڑے بڑے ادیب و شاعر پیدا کیے ہیں، جن میں خاص طور پر جون ایلیا (۱۹۳۱ء۔ ۲۰۰۲ء) کا نام سرِ فہرست ہے۔ یوسفی نے ساتھ ہی ساتھ امروہہ کی ایک مذہبی شخصیت حضرت شرف الدین شاہ ولایت کے مزار کا تذکرہ کیا ہے، جن کے مزار کے ارد گرد زہریلے بچھو بکثرت پائے جاتے ہیں، لیکن حیرانی کا امر یہ ہے کہ وہ کسی کو ڈنک نہیں مارتے اور کوئی اُن کو چھولے یا اُٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھ لے تو وہ اپنا ڈنک سکیڑ لیتے ہیں اور یہ سب حضرت شرف الدین شاہ ولایت کی شخصیت کا فیضان و اعجاز ہے۔ (۴۵) یوسفی کا کہنا ہے کہ اُردو کے قدیم و جدید شعرا و ادبا نے بچھو کی فطرت کو اپنا لیا ہے اور ایک دوسرے کو ڈنک مارتے پھرتے ہیں، اِس لیے یوسفی کہتے ہیں کہ:

> "کچھ دن ہوئے، اِس ضمن میں ایک تجویز ذہن میں آئی۔ وہ یہ کہ ہمارے چند سیاست دانوں، شاعروں، لیکھکوں، نقادوں، اخباروں اور رسالوں کے مدیروں کو بچھوؤں کے ساتھ چند روز گزارنے کے لیے سرکاری خرچ پر امروہے بھیج دیا جائے، تاکہ اُن کے فیضانِ صحبت سے یہ حضرات اپنے معاصرین کو کاٹنا اور ڈنک

مار نا چھوڑ دیں۔"(۴۶)

"سد سمندری" کے زیرِ عنوان یہ مضمون ۲۰ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو پاک امریکن کلچرل سنٹر (PACC) میں پڑھا گیا۔ پروفیسر ہارون الرشید نے یوسفی کو اِس پروگرام میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ پروفیسر موصوف چاہتے تھے کہ یوسفی مذکورہ نشست میں حالاتِ حاضرہ پر ضرور بات کریں۔ اِس ضمن میں یوسفی نے خاص طور پر معین قریشی (۱۹۳۰ء۔۲۰۱۶ء) اور جنرل ضیاء الحق (۱۹۲۴ء۔۱۹۸۸ء) کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ پاکستان میں اِنتخابات کے دنوں میں ووٹوں کی مانگ، جلسے، پارٹیاں، کارنر میٹنگز، ہارس ٹریڈنگ، ڈارک ہارس، لفافے اور لوٹے ایسی اصطلاحات پر پُر مزاح گفتگو کی ہے۔

"ضمیرِ واحد متبسّم" کے نام سے زیرِ بحث مضمون مشتاق احمد یوسفی نے بے مثل مزاحیہ شاعر و نثر نگار ضمیر جعفری (۱۹۱۶ء، ۱۹۹۹ء) کی شخصیت و شاعری کو بڑے خلوص اور محبت کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ یوسفی ضمیر جعفری سے اپنی پچاس سالہ رفاقت کی پُر خلوص یادوں کو مزاح کے پردے میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اُن کی ضمیر جعفری سے پہلی ملاقات ۱۹۵۱ء میں اُن کے ایک عزیز ترین دوست میاں فضل حسن کے توسل سے ہوئی۔ یوسفی کا کہنا ہے کہ اُنھوں نے ساری زندگی ضمیر جعفری کو کسی کی غیبت یا مذمت کرتے نہیں دیکھا۔ وہ اپنے دُکھ اور پریشانیوں کو سنا کر دوسروں کو مغموم نہیں کرتے تھے۔ وہ دوسروں کو تو خوشیاں بانٹتے تھے، مگر اپنے دُکھوں میں دوسروں کو شریک کرنا اُن کا مسلک نہ تھا۔ ضمناً اِس مضمون میں کرنل محمد خان (۱۹۱۰ء۔۱۹۹۹ء) کا ذکر خیر بھی قاری کی حسِ مزاح کو مہمیز لگاتا ہے۔ یوسفی نے کرنل محمد خان اور ضمیر جعفری کی شگفتہ بیانیوں سے اِس تحریر کو گل و گلزار بنا دیا ہے۔ یوسفی نے ضمیر جعفری کی شعری عظمت کے ساتھ ساتھ اُن کی نثر خاص طور پر اُن کے خاکوں کو بہت سراہا ہے۔

"مسند صدارت پر اولتی کی ٹپاٹپ" نامی یہ تحریر کراچی کلب میں جوش ملیح آبادی (۱۸۹۸ء۔۱۹۸۲ء) کی یاد میں منعقد ہونے والے ایک مشاعرے کی تقریب کا کلیدی خطبہ ہے، جس میں یوسفی رات گئے تک اور بعض اوقات پوری رات مشاعرے میں بیت جانے کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اتنی دیر تک ایسی محفلوں میں نہیں بیٹھ سکتے۔ اُن کا مزید کہنا ہے کہ عام طور پر تو مشاعروں یا تقریبات وغیرہ میں وزرا یا اعلیٰ عہدداروں کو بہ طور صدرِ مشاعرہ مدعو کیا جاتا ہے، مگر جب وہ دست یاب نہ ہوں تو پھر مجھ ایسے

کم حیثیت و کم رتبہ لوگوں سے کام نکالنے کی سعی کی جاتی ہے۔ پھر مشاعروں میں فرشی نشستوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بعض امراض میں مبتلا شعرا کے لیے فرشی نشستوں پر تادیر براجمان ہونا بہ ہر حال کارِ مشکل ہے۔ پھر مشاعرے میں بیٹھنے کے آداب کی خوب صورت توجیحات پیش کی گئی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ خراب اور مجہول شعر پر داد دینے اور وصول کرنے کے مختلف طریقے کمال چابک دستی سے سپردِ قلم کیے گئے ہیں :

> "شاعروں کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی میں جہانگیر خاں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔ شعر جتنا خراب ہو اتنی ہی زیادہ داد دیتے ہیں، جس سے شاعر کے دل میں اور زیادہ خراب شعر کہنے کا شوق اور ولولۂ تازہ پیدا ہوتا ہے۔ کچھ دن ہوئے ایک نامور شاعر جن سے ہمارا نیازمندی کا رشتہ ہے، تشریف لائے۔ فرمایا، سلام روستائی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ جہانگیر خاں آپ کے ہم پیشہ اور مداح ہیں۔ آپ کا بے حد لحاظ اور احترام کرتے ہیں۔ اُن سے میری سفارش کر دیجئے کہ میرے مصرعے پر داد نہ دیا کریں۔ جب سے انھوں نے داد دینی شروع کی ہے لوگ سمجھنے اور کہنے لگے ہیں کہ میں خراب شعر کہتا ہوں !"(۴۷)

"شاہ جی کی کہانی دوسرے شاہ کی زبانی" کے نام یہ مضمون ممتاز صحافی شفیع عقیل (۱۹۳۰ء۔ ۲۰۱۳ء) کی تین کتابوں کی تقریبِ رُونمائی کے موقع پر ۱۳مارچ ۲۰۰۰ء کو کراچی پریس کلب میں پڑھا گیا۔ اِس تقریب میں شرکت کرنے کی از حد معذرت کے باوجود مصنف نے یوسفی کو نہ صرف شرکت کرنے پر راضی کیا، بل کہ خطبۂ صدارت پیش کرنے پر بھی آمادہ کیا۔ اِس لیے اُنھوں نے کتابوں اور اُن کے مندرجات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف اُن کی ذاتی زندگی کے لیے احوال و آثار پر اکتفا کی ہے۔ اِس مضمون کے عنوان کا معاملہ یہ ہے کہ شفیع عقیل یوسفی کو احتراماً "شاہ جی" کہتے تھے، جس کے جواب میں یوسفی نے بھی شفیع عقیل کو شاہ جی کہنا شروع کر دیا۔ اِس مضمون میں یہ بے تکلفی خوب مزا کرتی ہے۔ یوسفی شفیع عقیل کی ابتدائی زندگی کے احوال و آثار بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اُنھیں بوجوہ غربت سکول کالج جانے کا موقع نہیں ملا۔ بچپن میں ہی اُنھیں اُن کے ماموں نے اغوا کر لیا اور اُن سے کافی عرصہ بیگار لیتے رہے۔ شفیع عقیل اُن کی بھیڑ بکریاں چراتے رہے۔ پھر عدالت کے ذریعے اُن کی رہائی ممکن ہوئی تو اُنھوں نے پڑھائی کی طرف

توجہ کی۔ شفیع عقیل ۱۹۵۰ء میں بہ طور صحافی روز نامہ "جنگ" سے منسلک ہوئے اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک اِس ادارے سے وابستہ رہے۔ تاحیات شادی نہ کی۔ ابتدا میں ایک جگھی میں رہتے تھے، پھر بعد میں ایک کھولی کرائے پر لے کر رہنے لگے۔ شفیع عقیل نے اپنی زندگی میں کئی چھوٹے چھوٹے کام کیے، کام کو کبھی عار نہ سمجھا، جو کام بھی کیا جم کر کیا۔ اُن کا اپنا بیان ہے کہ:

> "۱۹۴۷ء میں لاہور میں سڑکوں پر بے گور و کفن لاشیں پڑی ہوتی تھیں۔ ٹرینوں سے بھی گاجر مولی کی طرح کٹی ہوئی لاشیں نکلتی تھیں۔ انھوں نے نیشنل گارڈ میں بھرتی ہو کر لاشیں اُٹھائیں۔ چنوں کی بوریاں ڈھو ڈھو کر مہاجروں میں راشن تقسیم کیا۔ مدتوں کوڑے کے ڈھیروں اور گھوروں سے ٹین کے ڈبے اور بوتلیں جمع کرتے رہے۔ جلد سازی بھی سیکھی۔ ایک دوست کی شراکت میں سائن بورڈ پینٹ کرنے کی دُکان اس جگہ کھولی جہاں آج کل لاہور ٹی وی اسٹیشن ہے۔ مدتوں حمالی اور باربرداری کی۔ سڑک کے کنارے چھابڑی بھی لگائی۔ اُن کے والد راج مزدور تھے۔ بیٹے نے ریت نبھائی۔ محنت مزدوری کی اور غربت میں باوقار اور حوصلہ مند رہنے کا جانگسل ہنر سیکھا۔ ایک زمانے میں ایکٹر بننے کا شوق بھی چرایا۔ فرماتے ہیں، شاہ جی، میں نے دھندے سارے کیے ہیں، سب رستے دیکھے بھالے ہیں۔ ناکام نہیں گزرا۔ ہر کام جم کے کیا۔ رج کے کیا۔"(۴۸)

"الطاف گوہر اور گڑ کی ڈلی" کے زیرِ عنوان یوسفی نے یہ تاثراتی مضمون بے باک صحافی اور بیوروکریٹ الطاف گوہر (۱۹۲۳ء۔ ۲۰۰۰ء) کی کتاب "تحریریں چند" کے حوالے سے سپردِ قلم کیا ہے۔ یوسفی اُن کے کمالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ الطاف گوہر حلقہ اربابِ ذوق کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اُنھی کی کوششوں سے لندن اُردو مرکز کا قیام بھی عمل میں آیا۔ مغربی پاکستان کا ۱۹۶۳ء کا بجٹ پہلے پہل اُردو میں پیش کرنے کا سہرا بھی اُنھی کے سر ہے۔ اِسی طرح ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاک بھارت جنگ کے دوران فیلڈ مارشل ایوب خان (۱۹۰۷ء۔ ۱۹۷۴ء) نے جو لہو گرمانے والی شان دار تقریر کی تھی وہ بھی الطاف گوہر کے قلم کا ہی معجزہ تھا، تاہم بہ جُز اِن خصائص کے الطاف گوہر پر ایک یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ایوب

خان نے اُن کے کہنے پر صحافیوں کی آواز دبانے کے لیے آرڈی نینس جاری کیا، لیکن یوسفی اُن کی صفائی پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب اُنھوں نے ۲۰ ستمبر ۱۹۶۳ء وزارتِ اطلاعات کا قلم دان سنبھالا تو مذکورہ قانون کو نافذ ہوئے دس دن گزر چکے تھے۔ علاوہ ازیں اِس مضمون میں یوسفی نے طالع آزما سیاست کاروں، بیوروکریٹوں اور آمروں کو بھی آڑھے ہاتھوں لیا ہے۔ یوسفی نے اِس مضمون میں اس بات کو اُبھار کر بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح انتظار حسین، پاک ٹی ہاؤس کو بھول کر بھی نہیں بھول سکتے، بعینہٖ الطاف گوہر بھی حلقہ اربابِ ذوق کو اپنے جسم و روح سے الگ نہیں کر سکتے۔ لندن میں اُردو مرکز الطاف گوہر کا قائم کیا ہوا ہے اور نام بھی اُنھوں نے ہی رکھا ہے، لیکن ڈاکٹر عبادت بریلوی (۱۹۲۰ء۔ ۱۹۹۸ء) اِس مرکز کے قیام کی کہانی میں خود کو مرکزی کردار بنا کر دیگر کرداروں کو ساتھ جوڑ کر اُردو مرکز کے قیام کی جو وجہ بتاتے ہیں، اِس جھوٹ کو یوسفی نے نہایت چابک دستی سے بے نقاب کیا ہے۔

"یہاں کچھ پھول رکھے ہیں" کے نام سے یوسفی کا یہ مضمون نام ور شاعرہ شاہدہ حسن (پ۔ ۱۹۵۳ء) کی شاعری پر لکھا گیا ہے، جس میں یوسفی نے اُن کی شاعری کے مختلف گوشوں پر گفتگو کی ہے۔ خاص طور پر اُن کی شاعری میں نسوانی اظہارِ بیان کو یوسفی نے اپنی گفتگو کا جزو خاص بنایا ہے۔ اُن کے "اِک تارہ ہے سرہانے میرے" اور "یہاں کچھ پھول رکھے ہیں" ایسے شعری مجموعوں کی عزت افزائی کرتے ہوئے شاہدہ حسن کی شاعری کو جدید عہد کی اہم شاعرہ قرار دیا ہے۔

"میں اختتام ہوں اِک عہد کے فسانے کا" نامی یہ مضمون معروف غزل گو شاعر نظر امروہوی کے اعزاز میں ۸ مارچ ۲۰۰۸ء کو کراچی کلب میں پڑھا گیا۔ یوسفی نظر امروہوی کے بارے میں اپنی محبت کا اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ایک پُر اعتماد، طرح دار، سراپا اخلاص، خوش اخلاق اور خندہ رُو انسان ہیں اور یہی اوصاف اُن کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ یوسفی نے نظر امروہوی کے ترنم میں شعر خوانی کی بھی تعریف کرتے ہوئے اُنھیں جون ایلیا کی طرح مشاعروں کا ایک کام یاب شاعر قرار دیا ہے۔ نظر امروہوی اور یوسفی میں چالیس برس پرانی یاداللہ تھی۔ شیروانی کے بغیر مصنف نے اُنھیں کبھی نہیں دیکھا۔ یہی اُن کی تہذیبی شخصیت کی سب سے بڑی خاصیت تھی۔ اُن کے رکھ رکھاؤ اور لہجے میں ایک رُخصت ہوتی ہوئی تہذیب کا لوچ، رچاؤ اور بانکپن تھا، جس کا نظر امروہوی کو خود بھی خوب احساس تھا اور اِسی چیز کو

یوسفی نے اِس مضمون میں بیان کرنے کی کام یاب سعی کی ہے۔

"پلکوں سے پینٹ کرنے والا" کے زیرِ عنوان یہ مضمون کراچی کے ایک معروف مصور شاہد رسام کی تصویری نمائش کے موقع پر پڑھا گیا۔ یوسفی کے بہ قول شاہد رسام کی تصویریں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ اُنھیں برش کے بجائے اپنی پلکوں سے تشکیل دیتے ہیں۔ اُنھوں نے مصوّری کے ہر میڈیم میں طبع آزمائی کی ہے۔ خاص طور پر واٹر کلر، پنسل کلر، چار کول ڈرائنگ، پین اینڈ انک اور آئل کلر وغیرہ۔ شاہد کو بھی گل جی (۱۹۲۶ء۔ ۲۰۰۷ء) کی طرح گھوڑوں کی تصاویر بنانے میں کمال حاصل تھا۔ علاوہ ازیں یوسفی نے شاہد رسام کی بنائی گئی بعض تصاویر کے رنگوں اور موضوعات کے حوالے سے اپنے خیالات کا اِظہار کیا ہے۔

"قصہ خوانی بازار سے کوچۂ ماضی گیراں تک" یہ مضمون یادوں، باتوں اور ملاقاتوں پر محیط ایک تجرباتی تحریر ہے، جس کے کچھ حصے پشاور میں منعقدہ مختلف تقریبات میں پڑھے گئے۔ تیس برس بعد ڈیپارٹمنٹ آف کلچر کی دعوت پر یوسفی پشاور تشریف لے گئے تو اُنھیں یادوں، باتوں اور ملاقاتوں کی خوش بو نے اپنے حصار میں لے لیا۔ بالخصوص ممریز خاں، عبداللہ، ڈاکٹر روبینہ شاہین اور ظہور احمد اعوان کے حوالے سے یوسفی نے اپنی بے پایاں محبت کا اظہار کیا ہے۔ یوسفی یادوں کی رو میں بہہ کر اپنے بچپن کے دنوں کو یاد کرتے ہیں، جب وہ پتنگ بازی اور چوری چھپے سگریٹ نوشی کا شغل فرمایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے یوسفی کہتے ہیں کہ صنف ریختی کے ضمن میں لکھا گیا اُن کا مقالہ کمال درجے کا ہے۔ یوسفی نے پشاور کے قصہ خوانی بازار کی سیر کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ پشاور میں قصہ خوانی بازار کی مٹھائیاں، پوریاں، گلاب جامن، کتابوں کی دکانیں، پرانے دوستوں، پشاوری جوتوں، ڈین ہوٹل میں ہونے والے کیبرے ڈانس اور شراب و کباب کی محفلیں اِس شہرِ بے مثال کی یادیں اُن کی زندگی کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ یوسفی نے ظہور احمد اعوان کے خاکوں کی بھی حد سے سوا تعریف کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ابنِ حسن برنی، زہرہ نگاہ، صلاح الدین احمد، فاطمہ ثریا بجیا، ڈاکٹر صابر کلوروی، وارث سرہندی، مولانا ایوب دہلوی، حبیب حیدر آبادی، پروفیسر شکیب اور ڈاکٹر روبینہ شاہین کا ذکر بڑی محبت اور اخلاص کے ساتھ کیا ہے۔ جیسا کہ آغاز میں یوسفی نے خود اعتراف کیا ہے کہ اِس مضمون میں کوئی منطقی ربط و ضبط اور تناسبِ واقعات و حادثات موجود نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ واقعات کی رو خود بخود اپنا رستہ اختیار کر لیتی ہے۔ بات سے بات

نکلتی ہے اور سلسلہ کلام آگے بڑھتا رہتا ہے اور ریزہ خیالی اِس مضمون کی سب سے بڑی خوبی بن جاتی ہے، جس میں نوع بہ نوع واقعات اور مختلف مقامات کے ذکر سے قارئین محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ "سرخیلِ مزاح نگاراں" (۹) مشتاق احمد یوسفی کی آخری کتاب "شامِ شعرِ یاراں" میں مضامین، خاکے، ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں کی رسمِ اجرا پر تکلفاً پڑھی گئیں تقریریں گویا سبھی کچھ ہے۔ یہ درست ہے کہ اِن تحریروں میں تشکر و ممنونیت کا احساس ممدوحین کی بہ نفسِ نفیس موجودگی یوسفی کے قلم کی مانوس کاٹ کو پابند مروّت بنا دیتی ہے، جس کی وجہ سے بعض ایسی تحریروں میں قارئین اُس بے باک اور بے لاگ یوسفی کو غائب پاتے ہیں، جو تہذیبی، تاریخی اور سماجی بوالعجبیوں اور انسانی خامیوں پر بے رحمانہ کوڑے برسایا کرتا تھا۔ یہی مصلحت آمیزی یوسفی کے اِن مضامین کو اُن کی پہلی چار تصانیف کے مقابلے میں نحیف کر دیتی ہے۔ فی الاصل "شامِ شعرِ یاراں" کی آمد پر ادب شناسوں کی طرف سے مایوسی کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ آرٹس کونسل کراچی کی انتظامیہ نے بہ قول شخصے یوسفی کی "قلمی ریزگاری" کو یوسفی کے اہلِ خانہ (بچوں) کی معاونت سے جمع کر کے کتاب بنا ڈالی۔ اِس مجموعے میں شامل یہ وہ تحریریں ہیں، جنھیں یوسفی کے تنقیدی ذہن نے ناقابلِ اشاعت جانتے ہوئے فراموش کر دیا تھا۔ دوسرے یہ کہ اِس کتاب کو یوسفی کی تازہ ترین تصنیف کے طور پر پیش کیا گیا، اِس چیز نے بھی یوسفی کی ادبی ساکھ کو بہت نقصان پہنچایا۔ مزید یہ کہ اِس کتاب کی اشاعت نے اُن کے نصف صدی کے سحر کو تاراج کر دیا۔ تیسرے ربع صدی کے انتظار کے بعد اُن کی یہ کتاب اشاعت پذیر ہو رہی تھی، اِس لیے بھی لوگوں کی توقعات عروج پر تھیں کہ چوں کہ ایک طویل عرصے کے بعد کتاب آ رہی ہے تو یقیناً کوئی شاہ کار ہی ہو گی۔ دراصل "شامِ شعرِ یاراں" کی آمد سے پہلے ہونے والے شور شرابے اور جوش و جذبے نے بھی قارئین میں مایوسی کو فروغ دیا۔ اگر اِس کتاب کو یوسفی کے متفرق مضامین اور تقریروں کے مجموعے کے طور پر متعارف کروایا جاتا تو شاید اِس قدر شدید ردِ عمل کا سامنا نہ کرنا پڑتا، مگر سچ یہی ہے کہ اِس مقام پر آ کر یوسفی کا "یوسفی" ہونا بھی کام نہ آیا۔

راست یہی ہے کہ طنزیہ و مزاحیہ ادب کی روایت میں اِن ایسی تحریریں لکھنے والا دوسرا اور کون ہے؟ سچ یہی ہے کہ دیگر مزاح نگاروں کے مقابلے میں یہ فرمائشی اور قلم برداشتہ مزاج کی حامل تحریریں بھی اپنا اعلیٰ مقام رکھتی ہیں، مگر جب اِن تحریروں کو یوسفی کی پہلی چار کتابوں کے مقابل رکھ کر قارئین اِن میں بھی

"پال" والا وہی پرانا یوسفی ڈھونڈھتے ہیں تو بعض مقامات پر اُنھیں سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سو باتوں کی ایک بات یوسفی کی یہ تصنیف اُن کی گذشتہ تصانیف کی طرح رنگ نہ جما سکی، (۵۰) مگر اِس کے باوجود رہ و رسمِ دُنیا نبھانے کے لیے لکھے گئے اِس تحریری مواد کو کسی مردِ خلیق اور پیرِ مغاں کا آخری سبو سمجھ کر (۵۱) تبرک کے طور پر پڑھنا چاہئے، یا دوسرے لفظوں میں قاری کو گزارا کرنا چاہیے۔ مجموعی طور پر یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یوسفی کی آخری کتاب "شامِ شعرِ یاراں" وہ مقبولیت حاصل نہ کر سکی، جو اُن کی گذشتہ تصانیف کے حصے میں آئی تھی۔ مزید یہ کہ اِس تصنیف میں یوسفی کا فن کسی قدر ضعف کا شکار دکھائی دیتا ہے، یعنی اِس کتاب میں یوسفی کے تخلیقی ارتقا کا عمل عروج معکوس (Anti Climax) محسوس ہوتا ہے۔ اِسی بنیاد پر "شامِ شعرِ یاراں" کو یوسفی کی دیگر تخلیقات کے مقابلے میں کسی قدر کم زور تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے۔

حواشی

۱۔ سیّد امتیاز الدین، "مشتاق احمد یوسفی کی نئی کتاب شامِ شعرِ یاراں"، مشمولہ: روزنامہ سیاست (بھارت: ۲۳نومبر ۲۰۱۴ء)۔

۲۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا (لاہور: مکتبۂ کارواں، س۔ن)، ص۵۲۱۔

۳۔ مبین مرزا، "ایک ادیب کی مثالی زندگی یوسفی صاحب"، مشمولہ: قومی زبان (مشتاق احمد یوسفی نمبر) (کراچی: جلد۹۰، شمارہ ۱۲، دسمبر ۲۰۱۸ء)، ص۱۰۷۔

۴۔ ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، "یوسفی کا مزاح اور ان کا المیہ شعور"، مشمولہ: معیار (اسلام آباد: شمارہ ۲۰، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۸ء)، ص۲۳۰۔

۵۔ سیّد امتیاز الدین، "مشتاق احمد یوسفی کی نئی کتاب شامِ شعرِ یاراں"، محولہ بالا۔

۶۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، "مشتاق احمد یوسفی اور "شامِ شعرِ یاراں" (مطالعے، مغالطے اور معاملے)"، مشمولہ: امتزاج (کراچی: شمارہ ۱۵، جلد ۱۵، جون ۲۰۲۱ء)، ص۲۷۔

۷۔ ظفر سیّد، "بجھی بجھی "شامِ شعرِ یاراں"، بی بی سی اُردو ڈاٹ کام، (اسلام آباد: ۲۴اکتوبر ۲۰۱۴ء)۔

۸۔ ایضاً

۹۔ نامی انصاری، بیسویں صدی میں طنز و مزاح(انتخابِ نثر) (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۲ء)، ص۲۰۷۔

۱۰۔ ڈاکٹر اسلم فرخی، "خوشبوئے یوسفی"، مشمولہ: مشتاق احمد یوسفی کچھ یادیں کچھ باتیں، مرتبہ: اَمر شاہد (جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۸ء)، ص۱۵۷۔

۱۱۔ شفیع عقیل، ادب اور ادبی مکالمے (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۲ء)، ص۲۰۱۔

۱۲۔ ڈاکٹر مظہر احمد (مرتب)، اقوالِ یوسفی اور دیگر مضامین (دہلی: ایم۔آر پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص۷۔

۱۳۔ مذکورہ ناول اور دو سفر ناموں کے بارے میں اُردو کے نام ور شاعر افتخار عارف نے کراچی میں ایک تقریر کے دوران اِنکشاف کیا تھا، لیکن شنید ہے کہ یہ دونوں تخلیقات یوسفی کے کڑے معیار پر پورا نہ اُتریں، اِسی لیے اشاعت سے محروم رہیں۔

۱۴۔ طارق حبیب (مرتب)، "عکسِ جمالِ یار"، مشمولہ: مشتاق احمد یوسفی (چراغ تلے سے آبِ گم تک) (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء)، ص۷۵۔

۱۵۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، "مشتاق احمد یوسفی اور "شامِ شعرِ یاراں" (مطالعے، مغالطے اور معاملے)"، مشمولہ: امتزاج (کراچی)، ص۹۔

۱۶۔ عبدالرشید، "مشتاق احمد یوسفی سے مکالمہ"، مشمولہ: قومی زبان(مشتاق احمد یوسفی نمبر)، ص۱۷۸۔

۱۷۔ ڈاکٹر اسلم فرخی، "خوشبوئے یوسفی"، مشمولہ: مشتاق احمد یوسفی کچھ یادیں کچھ باتیں، ص۱۵۰۔

۱۸۔ سحر انصاری، "یوسف باکارواں"، مشمولہ: قومی زبان(مشتاق احمد یوسفی نمبر)، ص ۷۳۔

۱۹۔ شاکر حسین شاکر، "مشتاق احمد یوسفی: باتیں اور یادیں (۲)"، مشمولہ: روزنامہ ایکسپریس(لاہور: ۶جولائی ۲۰۱۸ء)۔

۲۰۔ سیّد عارف مصطفیٰ، "یہ اپنے یوسفی صاحب!"، مشمولہ: مشتاق احمد یوسفی کچھ یادیں کچھ باتیں، ص۲۶۹۔

۲۱۔ کلیم اختر، جہانِ ظرافت (لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۵ء)، ص۳۵۵۔

۲۲۔ سحر انصاری، "یوسف باکارواں"، مشمولہ: قومی زبان(مشتاق احمد یوسفی نمبر)، ص۶۹۔

۲۳۔ غلام رضوی گردش، دیا رِ خوش نَفَساں (شخصی خاکے) (دہلی: معیار پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء)، ص۴۰۔

۲۴۔ شفیع عقیل، ادب اور ادبی مکالمے، ص۲۰۲۔

۲۵۔ مجتبیٰ حسین، "پیش لفظ"، مشمولہ: اُردو طنز و مزاح کا یوسف ثانی: مشتاق احمد یوسفی، مصنفہ: ڈاکٹر بی بی رضا خاتون (جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۸ء)، ص۱۳۔

۲۶۔ Sarwat Ali, "Yousufi's World", THE NEWS (Lahore, 30 November, 2014).

۲۷۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری، "نابغۂ روزگار: مشتاق احمد یوسفی"، مشمولہ: قومی زبان(مشتاق احمد یوسفی نمبر)، ص۱۲۳۔

۲۸۔ مظفر بخاری، "چیدہ چیدہ"، مشمولہ: مشتاق احمد یوسفی کچھ یادیں کچھ باتیں، ص۳۷۱۔

۲۹۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر، "چیدہ چیدہ"، مشمولہ: مشتاق احمد یوسفی کچھ یادیں کچھ باتیں، ص۳۷۲۔

۳۰۔ Humair Ishtiaq, "Review: Sham-e-Shair-e-Yaara'n by Mushtaq Ahmad Yousuf", in: Dawn (Karachi, 16 November, 2014).

۳۱۔ مظفر برنی ایک صاحب طرز ادیب تھے، جو بھارت میں اڑیسہ اور ہریانہ کے گورنر اور اِندرا گاندھی کے دورِ حکومت میں سیکرٹری اطلاعات بھی رہے۔

۳۲۔ مشتاق احمد یوسفی، شامِ شعرِ یاراں (لاہور: جہانگیر بکس، س۔ن)، ص۳۰۔

۳۳۔ ایضاً، ص۳۴۔

۳۴۔ ایضاً، ص۳۶۔

۳۵۔ ایضاً، ص۵۹۔

۳۶۔ ایضاً، ص۸۱۔

۳۷۔ ایضاً، ص۹۰۔

۳۸۔ ایضاً، ص۱۰۶۔

۳۹۔ ایضاً، ص۱۱۶۔

۴۰۔ ایضاً، ص۱۲۱، ۱۲۲۔

۴۱۔ ایضاً، ص۱۲۸۔

۴۲۔ ایضاً، ص۱۳۰۔

۴۳۔ پنجاب اسمبلی میں ایک قرارداد کے ذریعے محترمہ بشریٰ رحمٰن کو "بلبلِ پاکستان" کے خطاب سے نوازا گیا۔

۴۴۔ مشتاق احمد یوسفی، شامِ شعرِ یاراں، ص۱۷۰۔

۴۵۔ ایضاً، ص۲۳۰۔

۴۶۔ ایضاً، ص۲۳۰۔

۴۷۔ ایضاً، ص۲۷۶۔

۴۸۔ ایضاً، ص۲۹۲۔

۴۹۔ نامی انصاری، "بیسویں صدی میں اُردو طنز و مزاح"، مشمولہ: بیسویں صدی میں اُردو ادب، مرتبہ: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (دہلی: ساہتیہ اکامی، ۲۰۰۲ء)، ص ۳۸۲۔

۵۰۔ ڈاکٹر غلام شبیر رانا، "مشتاق احمد یوسفی: زندگی بھی ہے مثالِ موجِ دریا"، مشمولہ: قومی زبان(مشتاق احمد یوسفی نمبر)، ص ۱۵۲۔

۵۱۔ سیّد امتیاز الدین، "مشتاق احمد یوسفی کی نئی کتاب شامِ شعرِ یاراں"، مشمولہ: روزنامہ سیاست (بھارت: ۲۳نومبر ۲۰۱۴ء)۔